لسانیات کے جدید مباحث

احسان قادر صدیق*
ڈاکٹر قاضی عابد**

Abstract:

Interest in linguistics has risen phenomenally in the last few years. With increasing frequency linguistics is now intruding even in discussions of literature. This resulting in increasing curiosity about linguistics and its place. The most pressing questions bear on the relations of linguistics to the more traditional formulations of the subject matter. These questions are too central and too complex to be treated so lightly.

There is, certainly a need for article that will go beyond what we have in interpreting linguistics to the Urdu scholars and in bringing it to bear on the questions met in their studies. Since very ancient times men have been interested in their language. As language has excited their curiosity it is necessary that to understand themselves they have seen that they must first understand language. at the same time it is recognized that pragmatic value of the ability to manipulate it well. Works that deals in various ways with language are known from most of the ancient civilizations.

By the 1930 s several well sub disciplines had

* پی ایچ ڈی سکالر، شعبہ اردو، بہاء الدین زکریا یونیورسٹی، ملتان
** صدر شعبہ اردو، بہاء الدین زکریا یونیورسٹی، ملتان

developed with in linguistics. we traced the development of three of them,

1. The oldest and still dominant branch was historical linguistics or comparative linguistics, largely discussing Indo European language family.
2. Much younger branch known as dialect geography linguistics. this had established its own identity but it was mostly over shadowed by its older sister.
3. Descriptive linguistics, this had originated mostly independently. Its antecedents were different in every country and development shows clear evidence of this. Little changes of ideas had taken place in phoneme,

Urdu language is now being introduced as official language in Pakistan, In this regard I think our duty toward Urdu linguistics is increased nabifold. We should develop better and modern methods of linguistics to increase its circle and we should take concrete steps to improve the standard of Urdu language .These goals can only be achieved if we study the structure of linguistics minutely.

I hope this article will provide initial step in this regard.

اردو ادب میں جدید لسانیات کے مباحث کے اطلاق کی ضرورت موجود ہے۔ اردو ماہرین لسانیات کے لیے ضروری ہے کہ وہ تیزی سے بدلتے ہوئے رجحانات کو اپنائیں اور قدیم روایتی تصورات کو ترک کر کے نئی اور جدید تحقیقات کی روشنی میں اردو زبان کو بین الاقوامی ابلاغ کی زبان بنانے میں اپنا کردار ادا کریں۔ اب جبکہ عدالت عالیہ نے اردو کو دفتری زبان قرار دیتے ہوئے ہر قسم کی خط و کتابت کو اردو زبان میں کرنے کے احکامات صادر کر دیئے ہیں اس لیے اب یہ بات زیادہ ضروری ہوگئی ہے کہ اردو رسم الخط اور اس کی ٹائپ پر خصوصی توجہ دی جائے۔ اردو زبان کے استعمال کے بڑھتے ہوئے رجحان کو مدِ نظر رکھتے ہوئے ضروری ہے کہ اردو لسانیات کے میدان میں مغرب کے ہم پلہ ہو کر ان کی زبانوں میں ہونے والے لسانی مباحث پر گہری نگاہ رکھیں اور ہر جدید تحقیق سے اردو لسانیات کو مستفید ہونے کا موقع فراہم کریں۔ تاکہ اردو زبان کو مزید فروغ حاصل ہو سکے۔

بولنے والے کی تہذیب زبان کی معنیات کی عکاس ہے۔معنیات متکلم کے تہذیبی رویوں کا عکس پیش کرتی ہے۔ابلاغ کی درست فراہمی کے لیے صورتحال اور موقع محل اہمیت رکھتے ہیں۔وہی کلام با مقصد اور متحرک ہوتا ہے جو سماجی سیاق میں ہوتا ہے۔یہی وجہ کہ علم بشریات میں بھی معنیات پر توجہ مرکوز کی جاتی ہے۔بشریاتی نقطہ نظر سے رشتوں اور فطرتی مظاہر اور عقائد کی گروہ بندی بھی زبان کے معنیاتی امتیازات پر اثر انداز ہوتی ہے۔اسی طرح زبان کے استعمال کرنے والوں کے تصورات، مشاہدات، مطالعات اور ذہنی رجحانات بھی معنیات کو متاثر کرنے والے عوامل ہیں۔نظام لسان کے ہر ماڈل یا جملے میں صوت اور معنی کی بھرپور نمائندگی ہونی چاہئے۔یعنی ماڈل ایسا ہو جس میں صوتی،قواعدی اور معنیاتی اصول ایک مربوط اکائی کی صورت موجود ہوں۔آج کل تخلیقی گرائمر میں ان اصولوں کو مدنظر رکھا جاتا ہے۔

تمام انسانی گروہ سماجی نظام کو اور اس سے وابستہ ادارے زبان اور اس کے معنیات کو غذا فراہم کرتے ہیں۔زبان کے ساختیاتی سانچے انہی لسانی گروہوں کے مزاج اور فکر کے زیر اثر پروان چڑھتے ہیں۔ہر لسانی گروہ کی تخیلاتی اور ذہنی صلاحیت دنیا کے بارے میں ان کے موجود ادراک اور شعور پر مشتمل ہوتی ہے۔محض زبان ہی انسانی شعور اور ادراک کی ترجمانی کی وسیلہ نہیں بنتی بلکہ انسانی تصورات اور ماحول کی بناوٹ وغیرہ بھی اظہار کا بالواسطہ ذریعہ ہیں۔زبان کی جڑیں لسانی گروہ کے ماضی میں ہوتی ہیں۔

اردو زبان کے حوالے سے اس حقیقت سے انکار نہیں کہ حروف تہجی،اور رموز واوقاف کی زیادتی کی وجہ سے طباعت اور اشاعت میں کچھ دشواریاں پیدا ہوتی ہیں۔اس کی وجہ ملک کے مختلف حصوں کے سماجی اور تہذیبی عوامل کے زیر اثر بول چال میں موجود انحرافات ہیں۔املا کی ہم آہنگی اور یکسانیت،طباعت اور اشاعت کے لیے ایک معیار کا کام کرتی ہے۔یہ کام عمومی طور پر ابتدائی تعلیم کے مراحل میں طے پا جانا ضروری ہے۔کیونکہ بچہ تدریس کے ذریعہ اردو سیکھتا ہے اور پھر عام بول چال سے اس کو مزید مدد حاصل ہو جاتی ہے۔ضروری ہے کہ علمی فروغ کے لیے اردو زبان کی کسی نہ کسی طرح معیار بندی کی جائے۔

لسانیات سائنس ہے اور اس کا کام حقائق سے بحث کرنا ہے۔لیکن لسانیات طبیعاتی سائنس نہیں ہے کیونکہ اس میں جس مواد سے بحث کی جاتی ہے۔اس کا تعلق مستقل اور غیر متغیر حقائق سے نہیں ہوتا۔لسانیات جس مواد سے بحث کرتی ہے وہ منطقی ہوتے ہیں۔اور ان میں افقی اور عمودی ہر سطح پر تبدیلیوں کے امکانات موجود رہتے ہیں۔

میری رائے ہے کہ لسانیات میں اضافہ اور ترمیم کا زیادہ تر کام غیر شعوری طور پر ہوتا ہے۔جبکہ اس کے مناہج مطالعہ اور طریق بحث کی تعریف اور توضیح ممکن ہوتی ہے۔چونکہ لسانیات ایک عمرانی علم ہے اس لیے اس کا تعلق لوگوں کے سماجی اور معاشرتی رویوں اور عوامل سے ہے۔اس لیے لسانیات کو محض جدید لسانیاتی توضیح،فونیمیات،

ساختیات اور تبادلی گرائمر تک محدود نہیں کیا جا سکتا۔ اور عمرانیاتی لسانیات کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ اسی لیے لسانی نظام کو تجرید کا نتیجہ قرار دیا جاتا ہے۔

اس مقالہ میں سیاق وسباق اور زبان کے تعلق پر بحث کی گئی ہے۔ اس کے علاوہ زبان اور سماجی معیارات، زبان اور علم کے درمیان تعلق پر بحث اس مقالہ میں شامل ہے۔ زبان کے کردار اور اس میں ہونے والی معنویاتی تبدیلیوں پر ماہرین کی رائے اور ان کی تحقیقات کو مقالہ کا حصہ بنایا گیا ہے۔ فن لفاظی پر خصوصی توجہ دی گئی ہے۔ لفظ اور بولنے والے کے باہمی تعلق کو واضح کرنے کی ضرورت ہے۔ جمالیاتی عمل، لسانیاتی خصوصیات سے مستفید ہونے کا طریقہ ہے۔ ہمیں معلوم ہونا چاہئے کہ کن حالات میں زبان کے خاکے قابلِ اہمیت ہوتے ہیں۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ عبارت کے گہرے معنوں کو ذمہ داری سے سمجھا جائے۔ معانی ایسی قوت ہے جو علامت اور بیان کے درمیان تعلق پیدا کرتی ہے۔ یہ معانی مکمل طور پر ثقافت کے ساتھ مخصوص ہوتے ہیں۔ ثقافتی ہم آہنگی اور تضادات کو مدنظر رکھتے ہوئے ثقافتی حدود کو قائم رکھنا ضروری ہے۔ لیکن یہ انتہائی مشکل کام ہے کیونکہ ثقافتی حدود میں تغیر موجود رہتا ہے۔ یہ ثقافتی تضاد دو ثقافتوں کے درمیان مکمل انحراف نہیں ہے بلکہ یہ لسانی تضاد ہے جو دو ثقافتوں کے درمیان مشابہہ طور پر ظاہر ہوتا ہے اور دو ثقافتی رویوں میں تعلق پیدا کرتا ہے۔

میری رائے میں واضح اور مضمراتی اسلوب میں فرق ضرور رکھنا چاہئے۔ واضح اسلوب کے لیے ایک ایسے سامع کی ضرورت ہے جو متعلقہ زبان کے بارے میں عمومی معلومات رکھتا ہو۔ جبکہ مضمراتی اسلوب کے لیے ایسے سامع کی ضرورت ہے جو ان حالات کے بارے میں بھی جانتا ہو جن حالات میں یہ پیغام جاری ہوا غالباً تمام انسانی زبانوں میں صریحی اور مضمراتی فاصلے موجود ہیں۔ کسی بھی متن کی تکمیل میں یہ فاصلے پہلو بہ پہلو موجود رہتے ہیں۔ مضمراتی اسلوب کی ترجمانی ہمیشہ موجود ذرائع سے ممکن نہیں ہوتی بلکہ اکثر مواقع پر اس کی وضاحت کے لیے سیاق وسباق کی ضرورت ہوتی ہے۔ سامع تک بات کے درست مفہوم کی رسائی کے لیے ضروری ہے کہ واضح اسلوب کو اپنایا جائے۔ تاکہ سامع بات کو اس کے درست تناظر میں سمجھ سکے۔

برصغیر میں مسلمانوں کی آمد سے قبل کوئی نہ کوئی زبان اس وسیع خطے میں رابطے کے لیے استعمال کی جاتی رہی۔ برصغیر کے مسلمانوں کی قومی اکائی کو پروان چڑھانے میں بہت سی زبانوں نے علاقائی سطح پر کردار ادا کیا۔ اس طرح قومی تشخص کی علامت کے طور پر اردو نے اپنا کردار ادا کیا۔ پاکستان کے وجود میں آنے کے بعد مشرقی پاکستان میں بنگالی زبان کو ذریعہ تعلیم قرار دیا گیا۔ ۱۸۰۰ء سے ہی بنگالی میں سنسکرت آمیزی کی تحریک کا آغاز ہو چکا تھا۔ آہستہ آہستہ اس میں سنسکرت کا عمل دخل بڑھ گیا اور ایسا محسوس ہونے لگا کہ بنگالی سنسکرت کی جانشین نظر آنے لگی۔ اور بنگالی کا پوتھی ادب جو مسلمانوں کی ثقافت کی عکاسی کرتا تھا پس منظر میں چلا گیا۔ بنگال کے شہروں میں اردو زبان ثانوی حیثیت میں بولی اور سمجھی جاتی تھی۔ لیکن مغربی پاکستان میں بنگالی کی حیثیت قطعی اجنبی اور انجان کی سی

تھی۔ پاکستان کے دونوں حصوں میں پڑھے لکھے اور اعلیٰ سطح کے طبقات میں رابطے کے لیے انگریزی زبان کو استعمال کیا جاتا تھا۔ اس طرح سے مرکز اور تمام صوبوں کی سرکاری زبان ہونے کا شرف بھی انگریزی کو حاصل تھا۔ اردو اگرچہ پاکستان کے کسی علاقے کی زبان تو نہ تھی لیکن بین الصوبائی رابطے کی زبان کی حیثیت سے رائج تھی۔ اور اسے ثانوی زبان کی حیثیت میں زیادہ سے زیادہ استعمال کیا جاتا تھا۔(۱)

پاکستان میں بولی جانے والی زبانوں کی تعداد خاصی زیادہ ہے۔ ماہرین لسانیات کے مطابق کثیر زبانوں کی موجودگی کو لسانی مطالعے کے لیے اچھا شگون قرار دیتے ہیں۔ مشہور ماہر صوتیات ڈاکٹر سدھیشور ورما نے ۱۹۴۲ء میں برصغیر کو لسانی جنت قرار دیا تھا۔ کیونکہ یہاں کی زبانوں کی وسیع انحراف انگیزیاں اس کو بہشتی سیرگاہ بناتی ہیں۔ برصغیر کے مسلمانوں کی قومی اکائی کی تحرک میں جہاں علاقائی زبانوں نے اہم کردار ادا کیا وہیں یہ قومی تشخص کی واضح ترین اور صریحی علامت بن گئیں۔

لسانیات کے مختلف شعبوں کے لیے عمدہ اور وافر مواد کی موجودگی جہاں ایک نعمت ہے وہیں یہ مسائل کا سبب بھی ہے جن کو سلجھانا آسان نہیں ہوتا۔ خاص طور پر اس وقت جب لسانی نفرتیں فسادات کے لیے راہ ہموار کر دیتی ہیں۔ اور یہ بھلا دیا جاتا ہے کہ زبان مقصود بالذات نہیں ہوتی۔ بلکہ معاشرہ کی تقویت کی وجہ افراد کا سماجی رویہ ہوتا ہے جو مستقل طور پر تقویت پاتا رہتا ہے اور افراد کے لسانی اور ابلاغی اعمال میں نئی روح پھونکتے ہیں۔ جو وسیع تر قومی تشخص کو برقرار رکھنے کے لیے اہم قردار ادا کرتے ہیں۔ ایسے مملک جن میں زبانوں اور بولیوں کی کثرت ہو۔ وہیں ایسے مسائل کا بھی سامنا کرنا پڑتا ہے جن کا تعلق زبان سے ہوتا ہے۔ مثلاً کس زبان کو کس قدر اہمیت دی جائے؟۔ کس زبان کو قومی زبان کا درجہ دیا جائے؟۔ ملک کے سماجی اور سیاسی ارتقا کے لیے ان سوالات کا درست جائزہ اور ان کا صحیح حل ناگزیر ہوتا ہے۔ جس کے لیے لسانی پالیسیوں کو ترتیب دیا جاتا ہے۔ یہ پالیسیاں کسی زبان کے مخصوص مقاصد کے لیے منتخب کرنے کے بعد بھی ایسے اقدامات لازمی ہوتے ہیں جو زبان اور مقاصد کی مناسبت اور اول الذکر اور موزانیت کے ضامن ہوسکیں۔ ان اقدامات کا تعلق زبان کی معیار بندی سے ہوتا ہے۔

لسانی پالیسی کو ترتیب دیتے ہوئے تین اہم مقاصد کو پیش نظر رکھنا چاہئے۔

۱۔ قومی وحدت اور قومی تشخص　　۲۔ جدید سائنس اور ٹیکنالوجی پر دسترس
۳۔ بین الاقوامی مواصلاتی رابطہ

جذباتی انداز میں مرتب کی جانے والی لسانی پالیسی سماجی اور علاقائی وقبائلی رقابتیں پیدا کرنے کا سبب بن سکتی ہے۔ اس لیے ضروری ہے کہ ملک کے عمرانی اور جغرافیائی حالات کو مدنظر رکھتے ہوئے ایسی لسانی پالیسی ترتیب دی جائے جو قومی تشخص کی آئینہ دار ہو۔ ہر وہ زبان جو ملک میں زیادہ بولی جاتی ہو ضروری نہیں ہوتا کہ اسے قومی زبان کے درجہ پر فائز کر دیا جائے۔ کیونکہ ایسا ممکن ہے کہ وہ زبان اپنے حلقے سے باہر نکلتے ہی اجنبی ہو جائے۔

اس حوالے سے بنگالی اور سندھی کی امثال کو سامنے رکھا جا سکتا ہے۔ جن کو کثیر تعداد میں لوگ استعمال کرتے ہیں مگر ان کو ایک مخصوص علاقے تک محدود سمجھا اور بولا جاتا ہے۔ جس کے باعث بین الاقوامی حیثیت میں خود کو تسلیم کرانے میں یہ زبانیں کامیابی حاصل نہیں کر سکیں۔

اس لیے ضروری نہیں کہ وسیع علاقے میں بولی جانے والی زبان کو قومی تشخص اور وحدت کی علامت قرار دی جا سکے۔ کسی زبان کو پہلی زبان کی حیثیت سے استعمال کرنے کا مقصد یہ ہر گز نہیں لیا جا سکتا کہ کہ وہ قومی تشخص کی علامت ہے۔ بلکہ قومی وحدت اور تشخص کے لیے ایسی زبان کا انتخاب کیا جاتا ہے جو ثانوی زبان کی حیثیت سے زیادہ سے زیادہ استعمال کی جاتی ہو۔ ''ڈاکٹر سینتی کمار چیٹر جی'' اس حوالے سے یہ رائے ظاہر کرتے ہیں کہ ۱۹۱۱ء کی مردم شماری کی رو سے بنگلہ کو ہندوستان میں سب سے زیادہ بولی جانے والی زبان کہا گیا۔ اسے دنیا کی ساتویں سب سے زیادہ بولی جانے والی زبان کا اعزاز حاصل ہوا۔ لیکن جب دنیا کی اعلیٰ زبانوں کی صف بندی میں بنگالی کو دیکھنے کی کوشش کی جاتی ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ دور تک اس کا نشان نہیں ملتا۔ **(۲)**

عمرانی لسانیاتی مواد سے زبان کے انتخاب میں دشواری کا سامنا نہیں کرنا پڑتا۔ لیکن پاکستانی زبانوں سے متعلق ایسے مواد کی فراہمی مشکل کام ہے۔ کیونکہ ڈاکٹر خلیل صدیقی کے مطابق ''پاکستان کا لسانیاتی جائزہ کبھی نہیں لیا گیا۔ یہاں کی زبانوں سے بحث کرتے وقت عموماً لسانی معلومات گریرسن کے (لسانیاتی جائزہ ہند) سے لی جاتی ہیں''۔ اس جائزے کا تعلق بیسویں صدی کے آغاز سے ہے۔ اس میں مواد کی فراہمی اور مطالعہ کا جو طریق کار اختیار کیا گیا ہے وہ جدید لسانیات کی رُو سے ناقابل اعتماد ہے۔ اس وقت سے اب تک جو تبدیلیاں لسانی حالات میں ہو چکی ہیں ان کا جائزہ گریرسن کے ماڈل سے لینا کئی مسائل کو جنم دیتا ہے۔ لیکن چونکہ اس کے علاوہ نئے جائزے کا فقدان ہے اس لیے گریرسن کے ماڈل کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

قومی اور سرکاری زبان کے انتخاب کے لیے کوئی بھی معقول اور معروضی کسوٹی ہو فیصلہ اردو کے حق میں ہو گا۔ اور اس فیصلے کو ہر سطح پر تسلیم بھی کر لیا گیا ہے۔ لیکن جب ہم صوبوں کی سطح پر دیکھتے ہیں تو اگر صوبوں کی تشکیل لسانی جغرافیہ کی رُو سے ہو تو صوبے کی اہم ترین زبان کو صوبائی نظم و نسق چلانے کے لیے استعمال کیا جانا چاہئے۔ اس کے لیے شرط اس زبان کی توانائی اور گہرائی ہے۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ یہ طے کیا جائے کہ صوبے میں بولی جانے والی سب سے بڑی اور اہم زبان کون سی ہے۔ لیکن یہ کام خاصا دشوار ہے۔ کیونکہ ایک زبان اپنی لسانی گروہی وسعت کی وجہ سے بڑی زبان کہلا سکتی ہے لیکن یہ ضروری نہین کہ اس میں اتنی وسعت اور گہرائی موجود ہو کہ وہ ہر سطح پر ابلاغ کا اچھا وسیلہ بن سکے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ زبان مخصوص معشیت، معاشرت کے تقاضوں کو پورا کرتی ہو۔ لیکن تجرید اور تعمیم کی صلاحیت کا اس میں فقدان ہو۔ جنوبی ایشیاء کی اکثر زبانوں سے متعلق ایسی شکایات موجود ہیں۔

فرانسیسی ماہر لسانیات جیولز بلاک اپنی مشہور کتاب ''L,Indo Aryan'' میں یہ خیال ظاہر کیا کہ''

ہندوستان کی زبانوں میں یہ صلاحیت نہیں کہ وہ جدید نظام تعلیم کا ذریعہ بن سکیں۔ کیونکہ ان زبانوں میں وہ نثری نحو موجود نہیں جو سائنس کی زبان بن سکے۔ یہی وجہ ہے کہ ان زبانوں میں سائنسی اصطلاحات اور تکنیک کا فقدان ہے''۔ جیولز بلاک نے یہ رائے کئی سال پہلے پیش کی۔ اس کے بعد ہندوستانی زبانوں نے اس کمی کو دور کرنے کی بھر پور کوشش کی جس میں اردو اور بنگالی کی کوششیں دوسری زبانوں کے مقابلے کہیں زیادہ ہیں۔ لیکن تا حال جدید ترین سائنس کی افہام و تفہیم کی کمی موجود ہے۔ **(۳)**

مادری زبان کو ابتدائی تعلیم کے لیے بہترین ذریعہ قرار دیا جاسکتا ہے۔ لیکن پاکستان میں جتنی زبانیں بولی جاتی ہیں ان سب کو ابتدائی ذریعہ تعلیم بنانا ممکن نہیں ہے۔ اس کی ایک وجہ تو اس زبان کی استعداد ہے جو تعلیم کی سطح پر ضروری فرائض سرانجام دینے کی اہلیت نہیں رکھتی۔ اس کے علاوہ معاشی اور انتظامی حوالوں سے بھی ان کے امکانات معدوم ہو جاتے ہیں۔ کسی زبان کو بھی ذریعہ تعلیم بنانے سے قبل لسانی انتخاب کے تقاضوں کو مدنظر رکھنا ضروری ہے۔ پرائمری سطح پر مادری زبان میں تعلیم دینے کا فائدہ یہ ہے کہ بچے میں صحیح تصورات کو پیدا کی جاسکتا ہے۔ لیکن اس سطح پر قومی زبان کو بھی مکمل نظر انداز کرنا مناسب نہیں ہے۔ کیونکہ اسکی ضرورت اور اہمیت کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔

جدید ترین سائنسی اصطلاحات اور ٹیکنالوجی کے بارے میں رائج علوم تک رسائی کے لیے ضروری ہے کہ کسی نہ کسی عالمی زبان کا سہارا لیا جائے۔ پاکستان میں اس کام کے لیے انگریزی زبان کا سہارا لیا جاتا ہے۔ انگریزی کو تعلیم کی ہر سطح اور اور ہر شعبہ تعلیم کے لیے ذریعہ بنانا بھی درست نہیں ہے۔ کیونکہ بہت سی اصطلاحات سے استفادہ حاصل کرنے کے لیے دوسری زبانوں کے علم کو جاننا بھی ضروری ہے۔ مادری زبان فکر کا بہترین وسیلہ بن سکتی ہے۔ لیکن اس کے لیے ضروری ہے کہ اس کی لسانی ضروریات پر پوری توجہ دی جائے۔ ان نازک اور اہم مسائل کو حل کرنے کے لیے جذباتی وابستگی اور مصلحت سے بالاتر ہو کر جدید لسانیات کی روشنی میں ان کو حل کرنے کی ضرورت ہے۔

اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ نو آزاد اور پسماندہ ممالک میں سیاسی رجحانات کی بنیاد عموماً جذباتی نعروں پر ہوتی ہے۔ جس سے گروہی مفادات کے لیے لسانیات کو استعمال کرنے کے امکانات میں اضافہ ہوتا ہے۔ ایسے ممالک میں لسانیات کو عوام کے جذبات کو ابھارنے اور اشتعال انگیزی پیدا کرنیکی روش اختیار کی جاتی ہے۔ لسانی جائزے کی بدولت مختلف زبانوں کے ماہرین اور دانشور اور دوسرے متعلقہ مسائل کے سلسلہ میں کام کرنے والے لوگ ذہنی اور فکری ہم آہنگی کے مواقع پیدا ہو سکتے ہیں۔ مختلف لسانی اور ادبی تنظیموں کو زبانوں کے فروغ اور زیادہ سے زیادہ توانائی اور صلاحیت پیدا کرنے کے لیے کام کرنا وقت کا تقاضا ہے۔ **(۴)**

زبانوں کی باہمی اخذ اور استفادہ، اثر و نفوذ کا سلسلہ غیر شعوری طور پر جاری رہتا ہے۔ جبکہ اس کی شعوری کوشش ادبی اور علمی سطح پر کی جاسکتی ہے۔ کسی مخصوص لسانی خطے اور دوسری خطے میں بولی جانے والی زبانوں کے درمیان موجود تعلق ایک زبان کے دوسری پر اثرات کو قبول کرنے میں مدد دیتا ہے۔ لیکن یہ بات بھی مسلمہ ہے کہ

عام لسانی دنیا جمہوری مزاج رکھتی ہے اور یہ کسی حکم کی تابع نہیں ہوتی۔ لیکن اس بات کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ کبھی احساس محرومی اور ذاتی مفاد کے لیے لسانیات کو استعمال کیا جاتا ہے۔

پاکستانی زبانیں علاقائی اور ذیلی تہذیبوں کی شناخت کی علامات ہیں۔ اس لیے ضروری ہے کہ ان تمام زبانوں کو طالع آزماؤں کے قبضے سے آزاد کرایا جائے۔ اور ان سب کے فروغ کے لیے مناسب اقدامات کیے جائیں۔ اور ان عوامل کو جڑ سے ختم کرنے کی کوشش کی جائے جو لسانی نفرتوں کو جنم دیتے ہیں۔ مختلف لسانی سرگرمیوں کے زریعہ تعلیمی، ادبی، اور قومی مقاصد کو اجاگر کر کے ہم لسانی مسائل پر قابو پا سکتے ہیں۔

اردو میں جدیدیت کو اصطلاح کے طور پر استعمال کیا گیا ہے۔ اس اصطلاح سے وہ تمام مطالب وابستہ کر دیے گئے ہیں۔ جو جدیدیت کے ممکنہ اور لغوی معانی ہیں۔ جدیدیت کے حوالے سے اردو میں لکھے گئے مقالات ایک عجیب صورت حال پیش کرتے ہیں۔ جدیدیت کے مرکزی خیالات میں تعقل اور تعبیر کے حوالے سے انتشار کی کیفیت پائی جاتی ہے۔ جدیدیت کی وضاحت کرتے ہوئے ہمارے ماہرین نے آزادی سے کام لیا ہے۔ جس کی وجہ سے جدیدیت کے مباحث میں انتشار کو راہ دی۔

آل احمد سرور کے مطابق ''جدیدیت کا نمایاں روپ آج آئیڈیالوجی سے بیزاری، فرد پر توجہ اور اس کی نفسیات کی تحقیق کی صورت میں عیاں ہے۔ جدیدیت محض انسان کی تنہائی نہیں بلکہ اس میں انسان کی عظمت کے ترانے بھی ہیں''۔ **(۵)**

ن۔م۔راشد کے مطابق جدیدیت کی ایک تعریف یہی ہو سکتی ہے کہ ''جو انداز نظر اپنے زمانے کے ساتھ ہم آہنگ ہو اور ماضی سے کسی قسم کی یگانگت نہ ہو۔ وہ انداز نظر جدیدیت کا حامل ہے۔ یعنی ایسا نقطہ نظر جس میں تخیلاتی یا مصنوعی زندگی کی ترجمانی کی بجائے جیتی جاگتی اور حقائق پر مبنی دنیا کی ترجمانی کی گئی ہو''۔

وزیر آغا کے مطابق ''جدیدیت خالصتاً ایک ادبی تحریک ہے ایک وسیع تحریک جس میں سماجی شعور کے علاوہ روانی، ارتقا اور تہذیبی نکھار اور تخلیقی سطح بھی شامل ہے''۔ **(۶)**

جدیدیت کی تعریف کے ضمن میں ''شمیم حنفی'' لکھتے ہیں۔ ''شعر و ادب اور فنون لطیفہ کی روایت کے تناظر میں جدیدیت ایک ذہنی اور تخلیقی اشاریہ ہے۔ تجدید پرستی کے مضمرات تاریخی اور مذہبی نوعیت کے ہیں''۔ **(۷)**

ڈاکٹر جمیل جالبی جدیدیت کے بارے میں رقمطراز ہیں ''ایک زمانے میں سرسید کی تحریک کا نام جدیدیت تھا۔ گویا جدیدیت سے مراد ایسا نقطہ نظر ہے جس کے ذریعہ سرسید نے قوم کو ماضی اور حال کو سمجھانے کی کوشش کی۔ اور جس کی مدد سے قوم کا احیا ممکن ہوا۔ ۱۹۳۵ء تک ٹیگور اور رومانی تحریک جدیدیت کے مترادف تھی۔ ۱۹۳۶ء میں جدیدیت ترقی پسندی کا نام تھا۔ ۱۹۴۷ء کے بعد اجتماعی شعور کا غزل کی صورت میں اظہار جدیدیت کہلاتا تھا۔ لیکن آج ہم اسے جدیدیت نہیں کہہ سکتے۔ اس سے تصدیق ہو جاتی ہے کہ جدیدیت ایک اضافی چیز ہے

جس کے معنی ہر دور اور ہر نسل کے ساتھ بدل جاتے ہیں‘‘۔(۸)

’’محمد حسن‘‘ کہتے ہیں۔ ہر ایسا ادب جدید ہوتا ہے۔ جو موجود زمانے کی حقیقتوں کی توضیح کرتا ہو اور اپنے طور پر توجیہہ اور تعبیر کر رہا ہو۔

فضیل جعفری ’’ہر زمانے میں ہونے والی نئی شاعری جس کا تعلق معاشرہ، عصریت اور سماج سے ہوتا ہے کو جدیدیت کا نام دیتے ہیں۔

جدیدیت کے بارے میں ان تعریفوں کا بغور جائزہ لینے سے معلوم ہوتا ہے کہ پہلے تو جدیدیت کو معاصریت کے مفہوم میں لیا گیا۔ جس میں ہر عمل، انداز فکر اور اظہار کے لیے اپنایا گیا ہر انداز جدید ہے۔ اور یہ انداز معاصر حقیقتوں سے ہم آہنگ ہو۔ بڑی حد تک اس کو جدیدیت کا لغوی مفہوم سمجھا گیا۔ ’’جدید‘‘ انگریزی زبان کے لفظ ماڈرن کا ترجمہ ہے۔ ماڈرن کا مادہ لاطینی زبان کے لفظ Modo سے ہے۔ جس کا مطلب Just Now سے ہے جس کا مطلب اردو میں ’’اسی لمحے‘‘ ہے۔ جس کا مفہوم زمانہ حال لیا جاتا ہے۔ عہد وسطیٰ میں فرانسیسی زبان میں یہ لفظ Moderene بنا اور جدید انگریزی میں یہ لفظ Modern بن گیا۔ تاہم عربی لفظ جدید کا کم وبیش وہی مفہوم ہے جو Modo کا تھا یعنی ’’اب‘‘۔ نئے زمانے اور نئے حالات اور خیالات کو ماڈرن کہا گیا۔

جدیدیت اقبال کی معاصر یورپی تحریک تھی لیکن اقبال کی شاعری پر اس کے اثرات نظر نہیں آتے۔ اگرچہ علامہ اقبال مغربی ادبیات سے پوری طرح آگاہ تھے۔ اس کا اندازہ ہمیں بانگ درا میں شامل امریکی اور برطانوی شعرا کی نظموں کے تراجم سے ہوتا ہے۔ علامہ اقبال جدیدیت سے مختلف تصور کائنات اور ذہنی رجحانات رکھتے تھے۔ مگر جدیدیت کے بعض تصورات علامہ اقبال کی شاعری کے بعض پہلوؤں سے تقابل کرنا دلچسپی سے خالی نہیں ہے۔

جدیدیت کی تجربہ پسندی، روایت شکنی، انفرادیت پسندی، اقبال کے ہاں مغربی پس منظر میں موجود نہیں۔ اقبال نے نئی ہیئتوں کو تلاش اور استعمال کرنے کی بجائے روایتی ہیئتوں کے استعمال کو موزوں سمجھتے ہیں۔ اس طرح علامہ اقبال نے روایت سے اپنے تعلق کو قائم رکھا۔ جسے توڑنا جدیدیت اپنی شعریات کے اظہار کے لیے لازم سمجھتی ہے۔ جدیدیت میں اس تصور کو بتا گیا کہ ہر فن پارہ ’’مواد اور ہیئت‘‘ پر مشتمل ہوتا ہے۔ اور ان دونوں میں موجود تعلق لازم اور ملزوم کا ہے۔ علامہ اقبال نے اسلوبی سطح پر تجربہ پسندی اور روایت شکنی کا مظاہرہ کیا جو ایک خاص مفہوم میں ان کی شاعری میں موجود ہے۔ علامہ اقبال نے اپنی شاعری کے ذریعے قطعی منفرد ڈکشن کو نہ صرف متعارف کرایا بلکہ تخلیقی شان کے ساتھ اسے پیش کیا ہے۔ اتنی شدید انفرادیت شاید ہی کسی دوسرے شاعر کے یہاں موجود ہو۔ جس کا مظاہرہ اقبال نے کیا۔ جدیدیت میں انفرادیت پر زور ملتا ہے۔ لیکن اقبال کی انفرادیت ان کی اپنی انفرادیت ہے۔(۹)

مشرقی شعریات میں انفرادیت کے مظاہرے کو جدت کا نام دیا گیا ہے۔ اس ضمن میں حسن ادا، مضمون آفرینی، نازک خیالی جیسی اصطلاحات کا استعمال ہوا ہے۔ یہ تمام اصطلاحات جدیدیت کی فروع ہیں۔ اس طرح

جدیدیت کا تعلق معنی اور اسلوب دونوں کے ساتھ ہے۔ جدیدیت کو مانوس اشیا کے مخفی امکانات کی دریافت کا عمل قرار دیا جا سکتا ہے۔ جدیدیت اگرچہ روایت سے نمودار ہوتی ہے لیکن روایت پرستی سے انحراف کرتی ہے۔ دوسرے الفاظ میں جدت کا انحراف اس وقت ممکن ہے جب روایت کا علم موجود ہو۔ روایت کا جتنا وسیع اور گہرا تصور اقبال کے ہاں ملتا ہے دوسرے شعرا کے ہاں یہ تصور اتنی شدت سے موجود نہیں ہے۔ علامہ اقبال نے نہ صرف مشرقی ادبی روایات کو دریافت کیا بلکہ اسے مرتب بھی کیا ہے۔

علامہ اقبال کا تصور روایت، مابعد جدید تنقیدی اصطلاح بین متنی ہے۔ فارسی، عربی، اردو اور سنسکرت ادبیات مختلف متون ہیں۔ جن کو اقبال نے باہم اکٹھا کیا ہے۔ اس طرح اقبال نے مختلف مشرقی روایات کو ایک نئے متن میں منقلب کر دیا ہے۔ اقبال کا شعری متن کے اجزا متن کے میکانکی نہیں بلکہ نامیاتی عناصر ہیں۔ اقبال کا شعری متن ایک زندہ متن ہے۔ جدیدیت کے نظام فکر میں فرد کو بنیادی اہمیت حاصل ہے۔ بطور منفرد اور تنہا وجود فرد کا زندگی کو براہ راست اور طریقے سے تجربہ کرنا اور اس تجربے کے نتیجے میں اپنی تقدیر پر انحصار اس کی بے چارگی کا اظہار ہے۔

جدیدیت کی توضیح جیسے کہ اوپر کی تعریفوں میں کی گئی ہے اس میں جدیدیت کو انسانی عظمت کا ترانہ کہا گیا ہے۔ انسان کی عظمت کا تصور ہیومن ازم کے فلسفے نے دیا۔ جسے روشن خیالی نے آگے بڑھایا۔ لیکن اس میں انسان کی عظمت کے حقیقی جدید تصور کی وضاحت نہیں کی گئی۔ بعض ماہرین نے جدیدیت کو ''اضافی'' کہا ہے۔ جس کے مطابق ہر زمانے کی اپنی جدیدیت ہے۔ یہ جدیدیت کی من مانی تعبیر ہے۔ (۱۰)

سرسید کی تحریک اور ۱۹۴۷ء کے بعد کے تخلیقی رویوں کو جدیدیت قرار دینا اور اس نتیجہ کو اخذ کر لینا کہ جدیدیت اضافی چیز ہے، جدیدیت کے حقیقی تصور سے چشم پوشی کے سوا کچھ نہیں۔ درحقیقت سرسید کی تحریک نے عقلیت اور رجائیت کے ان عناصر کو قبول کیا جو ماڈرنیٹی سے مخصوص ہیں۔ انہی عناصر کو ذرا مختلف مفہوم کے ساتھ ترقی پسند تحریک نے جذب کر لیا۔ لہٰذا اسے بھی ماڈرنیٹی سے ہم رشتہ قرار دیا جاتا ہے۔ جب کہ رومانی تحریک اور ۱۹۴۷ء کے بعد کے تخلیقی رویوں کے پس پشت ماڈرن ازم کے تصورات موجود ہیں۔

جدیدیت کے ان امتیازات کو ملحوظ نہ رکھنا اور انہیں نظر انداز کرنا بظاہر تساہل پسندی سے کام لینے کے مترادف ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ سارا عمل دراصل جدیدیت کا ایک مخصوص ڈسکورس قائم کرنے کے مترادف ہے۔ اس ڈسکورس کی خصوصیت جدیدیت اول وثانی کی اصل روح اور حقیقی تناظر تک عدم رسائی ہے۔ اس کی بڑی وجہ نوآبادیات ہے۔ جو نوآبادکار ممالک کی تہذیب اور علوم کو قابل قدر اور تقلید کے قابل بنا کر پیش کرتی ہے مگر ساتھ ہی مقامی باشندوں کو ان کی روح سے دور رکھنے کا سامان بھی کرتی ہے۔ چنانچہ تمام نوآبادیاتی ممالک میں ایسی ذہنیت کو فروغ دیا جاتا ہے۔ جو سطحی ہو۔ اردو میں جدیدیت کے مباحث میں اسی ''نوآبادیاتی ذہنیت'' کو کارفرما دیکھا جا سکتا ہے۔ اور اسی ذہنیت کے سبب اردو میں جدیدیت نہ اپنے حقیقی سیاق وسباق کے ساتھ زیر بحث آ سکی ہے اور نہ

جدیدیت منطقی صلاحیت کے ساتھ رائج ہو سکی ہے۔ آج بھی اردو میں جدیدیت کے مباحث کی یہ صورت حال، جدیدیت کو اس کے اصل تناظر میں سمجھنے کا تقاضا کرتی ہے۔

لسانیات کی مختلف تعریفوں کو اگر ہم ایک لمحے کے لیے نظر انداز کر دیں تو بھی ایک بات یقین سے کہی جا سکتی ہے کہ اس کا موضوع زبان ہے۔ ادب زبان کی قلب ماہیت کرتا ہے۔ یہ زبان کو نشانیاتی سطح پر تبدیل کرتا ہے۔ یہ تبدیلی مارفیمی سطح پر بھی ہوتی ہے اور معمولی نحوی تبدیلی بھی ہو سکتی ہے۔ باالفاظ دیگر یہ کہنا درست ہوگا کہ ادب ''نئی زبان'' کی ایجاد کا موجب بنتا ہے۔ اس نئی زبان کے اندر خاص نوعیت کا مفہوم مضمر ہوتا ہے۔ جس کے مطابق زبان کسی سماجی گروہ کی روزمرہ ابلاغی ضروریات کی تکمیل کا نظام ہے۔ بلوم فیلڈ ادبی زبان کو لسانیاتی تحقیق کا کوئی شعبہ نہیں سمجھتا۔ ان کے مطابق ایک ماہر لسانیات تمام افراد کی زبانوں کا مطالعہ یکساں طور پر کرتا ہے۔ اسکسی ادیب کی زبان کے انفرادی اوصاف سے کوئی دلچسپی نہیں ہوتی۔ اس کی دلچسپی کا محور اس زمانے کے تمام لوگوں کی زبان کے اوصاف جاننے میں ہوتی ہے۔ بلوم فیلڈ کا یہ بیان لسانیات کا ادب کی طرف عمومی رجحان کا عکاس ہے۔

لسانیات زبان کا سائنسی مطالعہ کرتی ہے۔ سائنسی مطالعہ تفہیم، وضاحت، توجیہہ اور تجزیے سے غرض رکھتا ہے۔ لسانیات میں ایک قسم کے اظہار کو دوسرے پر ترجیح دینے کا اقدام نہیں کیا جاتا۔ کیونکہ ترجیح دینے کا عمل اقداری ہے جبکہ لسانیات کو اقدار سے کوئی غرض نہیں ہوتی۔ اس لیے ایک زبان کو دوسری سے برتر یا کم تر ثابت کرنے کی کوشش ہمیں لسانیات میں نہیں ملتی۔ اس لیے لسانیات ایک عام آدمی کی زبان اور کسی عظیم ادیب کی زبان میں فرق نہیں کرتی۔ اس طرح یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ خالص لسانیات کی رو سے اقبال اور عام شخص کی زبان میں کوئی فرق نہیں۔ لسانیات دونوں کے اسلوب میں محض فرق کو دیکھتی ہے۔ اور اس صورت حال کو جاننے کی کوشش کرتی ہے جو اس فرق کی ذمہ دار ہے۔

لسانیات اپنے مفہوم کے حوالے سے سماجی علم ہے۔ اور زبان اس کی سماجی تشکیل ہے۔ لسانیات اس تشکیل کی نوعیت اور اس میں مضمر قوانین اور ارتقا کا جائزہ لیتی ہے۔ لسانیات کا معروض یعنی زبان، عمرانی، ثقافتی، اور ذہنی تشکیلات سے مختلف اور ان سب پر حاوی ہوتی ہے۔ اسی وجہ سے زبان دیگر سماجی علوم سے مختلف اور ان سب پر حاوی ہوتی ہے۔ لسانیات کو اصولی طور پر دو حصوں میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ ایک کو عمومی لسانیات سے جبکہ دوسرے کو توضیحی لسانیات کا نام دیا جاتا ہے۔ عمومی لسانیات زبان کا جبکہ توضیحی لسانیات کسی مخصوص زبان کا مطالعہ کرتی ہے۔

جدید لسانیات کا آغاز ۱۸۶۷ء سے متصور ہوتا ہے۔ جب ولیم جونز نے اس بات کا انکشاف کیا کہ سنسکرت، یونانی، لاطینی، اور جرمن زبانون سے تعلق رکھتی ہے۔ مگر درحقیقت یہ تاریخی اور تقابلی لسانیات کا آغاز تھا۔ پوری انیسویں صدی میں تاریخی لسانیاتی مطالعہ کا دور رہا۔ تاریخی لسانیات زبان کی جامع سوانح مرتب کرنے کا نام ہے۔ یہ زبان کے عہد بہ عہد تغیرات کا جائزہ لیتی ہے۔ اور زبان کے ارتقا کا جامع تصور سامنے لاتی ہے۔ اس طرح

تاریخی لسانیات زبان کے تحرک کو ثابت کرتی ہے اور اس کے جامد پن سے انکار کرتی ہے۔ زبان کا یہ تحرک الفاظ، معنی، صرف ونحو تمام سطحوں پر موجود ہوتا ہے۔ جہاں تاریخی لسانیات زبان کے ارتقا اور تحرک کو سامنے لانے کا فریضہ سرانجام دیتی ہے وہاں یہ ایسا علم فراہم نہیں کرتی جو ایک زبان کے بولنے والوں کے لیے ابلاغی ضرورتوں کے کام آ سکے۔ اس طرح تاریخی لسانیات کا دائرہ کار محدود ہو جاتا ہے۔

میری رائے میں سیاق وسباق کو لسانیاتی مطالعہ کے تمام پہلوؤں میں اہم قرار دیا جانا چاہئے۔ چونکہ گفتگو انسانوں کی فطرت پر منحصر ہوتی ہے۔ اس لیے معنی کا تبادلہ لازمی طور پر عام بولنے والے کے سماجی اور ثقافتی پس منظر پر انحصار کرتا ہے۔ زبان اور سیاق وسباق میں گہرا تعلق ہوتا ہے۔ اس لیے کسی بھی زبان کے معانی تک رسائی کے لیے سیاق وسباق میں گہرے تعلق کے بارے میں معلومات کا جاننا ضروری ہوتا ہے۔ یعنی وہ تمام تناظراتی عوامل جن میں چہرے کے اتار چڑھاؤ، ماحول، ثقافتی اثرات اور لہجے پر خصوصی توجہ ہی سیاق وسباق کو واضح کرتے ہیں۔ اس لیے جس قدر سیاق وسباق واضح ہوگا اسی قدر زبان اپنے مفہوم کو واضح کر سکے گی۔

اردو میں لسانیاتی مطالعہ کو جامع قرار نہیں دیا جا سکتا۔ کیونکہ اردو میں لسانیاتی نظریات کسی نہ کسی مخصوص نقطہ کو پیش نظر رکھ کر چند مخصوص پہلوؤں کو اجاگر کرتے نظر آتے ہیں۔ بعض ماہرین لسانیات نے کوشش کی ہے کہ لسانیات کی جامع انداز میں توضیح اردو میں پیش کی جائے۔ اگر یہ کہا جائے تو مناسب ہوگا کہ اب ایک علم کی مرکزیت یا اجارہ داری نہیں رہی۔ اس لیے جدید لسانیات کے مباحث کو یورپ سے باہر دیگر خطوں میں کسی اجنبیت کا سامنا نہیں کرنا پڑتا۔ اس لیے ضروری خیال کرتا ہوں کہ اردو ادب کو ان مباحث سے زیادہ سے زیادہ مستفید ہونے کی ضرورت ہے۔

حوالہ جات

۱۔ محی الدین قادری، زور، ''ہندوستانی لسانیات''، عزیز پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۹۲ء۔

۲۔ مسعود حسین خان، ڈاکٹر ''مقدمہ تاریخ زبان اردو''، اردو مرکز لاہور، ۱۹۶۶ء۔

۳۔ سہیل بخاری، ڈاکٹر ''اردو کی کہانی''، مکتبہ عالیہ لاہور، ۱۹۷۵ء۔

۴۔ گیان چند جین، ڈاکٹر ''عام لسانیات''، قومی کونسل برائے فروغ اردو، نئی دہلی۔

۵۔ آل احمد سرور، ''جدیدیت اور ادب''، ۱۹۶۷ء۔

۶۔ وزیر آغا، ڈاکٹر ''تنقیدی تھیوری کے سو سال''، حفیظ پرنٹرز، لاہور، ۲۰۱۲ء۔

۷۔ شمیم حنفی، ''جدیدیت کی فلسفیانہ اساس''،

۸۔ جمیل جالبی، ڈاکٹر، 'ادبی تحقیق'، مجلس ترقی ادب، لاہور، ۱۹۹۴ء۔

۹۔ ناصر عباس نیر، ڈاکٹر ''لسانیات اور تنقید''، پورب اکادمی، اسلام آباد، ۲۰۰۹ء۔

۱۰۔ ناصر عباس نیر، ڈاکٹر ''مابعد جدیدیت اطلاقی جہات''، مغربی پاکستان اکیڈمی، کراچی۔